مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر "تدبر قرآن" کے

قسط نمبر 2

تفسیری اصولوں کا جائزہ

مولانا حافظ صلاح الدین یوسف (مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان)

اس سے واضح ہے کہ "نظم قرآن" پر اتنا زور دینا کہ جہاں یہ واضح نہ ہو تکلف اور تصنع سے نظم کشائی کیلئے کام لینا، نیز فہم قرآن کے لیے اس کو شاہ کلید قرار دینا، یکسر غلط ہے۔ اسی لیے مفسرین امت نے اس سے خاص اجتناب نہیں کیا ہے بلکہ احادیث کی روشنی میں (شانِ نزول کی صحیح روایات سمیت) قرآن کی تفسیر کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جہاں نظم واضح ہے، اس کو واضح بھی کیا ہے لیکن اس کیلئے نہ تکلف کا سہارا لیا اور نہ احادیث سے بے اعتنائی برتی۔

اس موقف کے حامی مفسرین کا سب سے بڑا اعتراض نظم کے قائلین پر یہی ہے کہ اس طریقہ تفسیر میں احادیث کو نظر انداز کیے بغیر چارہ نہیں ہے، چنانچہ امام شوکانی لکھتے ہیں: (یہ کافی طویل اقتباس ہے، ہم اہل علم کیلئے اصل عربی اقتباس بھی پیش کرتے ہیں اور بعد میں ترجمہ بھی)۔

اس کا ضروری خلاصہ یہ ہے کہ آیات وسور کے درمیان نظم ومناسبت کی تلاش ایسا تکلف ہے جس کا ہمیں مکلف نہیں بنایا گیا جبکہ قرآن کا نزول حسب حالات مختلف ادوار اور ماحول میں ہوا ہے ان میں مناسبت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس میں تکلف اور اپنی رائے کا استعمال ناگزیر ہے جو ممنوع ہے وغیرہ وغیرہ۔ (مذکورہ بالا طویل اقتباس کا مکمل ترجمہ بھی ملاحظہ ہو)

"جان لو کہ بہت سے مفسرین نے ایک نہایت پر مشقت علم (تفسیر) دریافت کیا ہے اور ایسے سمندر میں غوطہ زنی کی ہے جس کی تیراکی (غواصی) کے وہ ذمہ دار نہیں بنائے گئے۔ نیز انہوں نے اپنے اوقات ایسے فن میں صرف کیے جو ان کیلئے بے فائدہ ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو ایسی مجرد رائے اور گمان سے کام لینے پر مجبور کیا جو کتاب الٰہی کے معاملات میں ممنوع ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ ترتیب کے مطابق قرآنی آیات کے درمیان نظم ومناسبت (تلاش کرنے) کا التزام کیا ہے۔ اس کیلئے

ان کو اس راہ میں ایسے تکلفات اور اس قدر تصنع سے کام لینا پڑا ہے کہ حق وانصاف ان سے براءت کا اظہار کرتے اور بلغاء کا کلام ان سے پاک ہوتا ہے چہ جائیکہ رب تعالیٰ کا کلام ایسا ہو۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے اس موضوع پر علیحدہ سے کتابیں تصنیف کی ہیں اور اس (نظم) کو تالیف کا اہم مقصد قرار دیا ہے جیسا کہ بقاعی نے اپنی تفسیر میں کیا ہے اور ان کے (بعض) پیش روؤں نے بھی کیا، جن کا تذکرہ بقاعی نے اپنے مقدمے میں کیا ہے۔

یہ بات ہر اس شخص کیلئے نہایت تعجب انگیز ہے جو اس حقیقت سے واقف ہے کہ قرآن اپنے نزول کے آغاز سے رسول اللہ ﷺ کی وفات تک مختلف حالات وواقعات کے مطابق متفرق شکل میں اترا ہے۔ عام تو کجا، ہر صاحب عقل وشعور اس امر میں شک نہیں کرسکتا کہ نزول قرآن کے مقتضی یہ حالات وواقعات بجائے خود ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہیں، بلکہ بعض اوقات باہم متضاد بھی ہیں۔ جیسے کسی چیز کی حرمت بیان کرنا جو پہلے حلال تھی یا کسی چیز کی علت بیان کرنا جو پہلے حرام تھی۔ ایک بات کو کسی شخص کیلئے ثابت کرنا جبکہ دوسروں کیلئے اس سے پہلے وہ اس کے برعکس تھی۔ کبھی گفتگو کا موضوع مسلمانوں کے ساتھ تھا کبھی کافروں کے ساتھ، کبھی ماضی کے لوگوں کے ساتھ تھا اور کبھی حال کے لوگوں کے ساتھ، کبھی عبادت زیر بحث آتی اور کبھی معاملات، کبھی ترغیب کا ذکر ہوتا تو کبھی ترہیب کا، کبھی بشارت ہوتی تو کبھی انذار وڈراوا اور کبھی دنیا کا معاملہ زیر بحث ہوتا تو کبھی آخرت کا۔ بعض اوقات درپیش مسائل اور پریشانیوں کا حل بیان ہوتا اور کبھی گزرے ہوئے قصے اور واقعات بیان ہوتے۔

جب اسباب نزول اس قدر مختلف اور ایک دوسرے سے اتنے جدا ہیں کہ ان میں وحدت اور ہم آہنگی نہایت مشکل ہے تو ان اسباب کے تحت نازل ہونے والا قرآن بھی اسی انداز کے اختلافات کا مظہر ہوگا۔ آخر کوئی صاحب عقل بھی اسی انداز کے اختلافات کا مظہر ہوگا۔ آخر کوئی صاحب عقل وشعور سانڈے اور مچھلی کے درمیان، آگ اور پانی کے درمیان اور ملاح اور حدی خوان کے درمیان مناسبت کیسے تلاش کرے گا؟ کیا یہ ان لوگوں کیلئے شک کا دروازہ کھولنے اور اس کا دائرہ وسیع کرنے کے مترادف نہ ہوگا جن کے دلوں میں مرض ہے یا جن کی بیماری محض جہالت اور کوتاہی ہے جب ایسے لوگ دیکھیں گے کہ اہل علم قرآن کی تمام آیتوں کے درمیان مناسبت (نظم کی تلاش) پر گفتگو کر رہے ہیں اور اس پر مستقل کتابیں لکھ رہے ہیں تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ یہ

(نظم) ایک ناگزیر علم ہے اور یہ کہ قرآن اسی وقت بلیغ اور معجزہ مانا جائے گا کہ جب مناسبت کی وجہ ظاہر اور ربط و مناسبت (نظم) کو واجب کرنے والی چیز واضح ہو جائے۔ پس اگر اسے آیات کے درمیان اختلاف نظر آئے گا اور وہ اس سلسلے میں متکلمین کے اقوال کی طرف رجوع کرے گا اور وہاں اسے محض تصنع اور تکلف نظر آئے گا تو اس کے دل میں، اس مفروضے کی وجہ سے کہ قرآن کا نزول موجودہ ترتیب کے مطابق ہی ہے، شک پیدا ہو جائے گا، جبکہ اس سے پہلے اس کا دل قرآن کے بارے میں بالکل صاف تھا۔

آخر یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے جبکہ ہر شخص جسے کتاب الٰہی کا ادنیٰ سا علم بھی ہے اور اس کی تھوڑی بہت بھی معرفت رکھتا ہے وہ یقینی طور پر جانتا ہے کہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ اگر کسی کو شک ہو، اگر چہ اہل علم اس میں شک نہیں کر سکتے تو وہ اسباب نزول کا علم رکھنے والے اہل علم کی باتوں کی طرف رجوع کرے جو حالات و واقعات نبوت سے بھی واقف ہیں، تو اس کا سینہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور شک وریب اس سے زائل ہو جائے گا۔ اس کیلئے درمیانی درجے کی سورت کا مطالعہ کر لینا ہی کافی ہوگا (لمبی سورت تو بہ درجہ اولیٰ زیادہ ممد ثابت ہوگی) اس پر یقیناً یہ واضح ہو جائے گا کہ وہ ایسی آیات پر مشتمل ہیں جو مختلف حالات اور جدا جدا اوقات میں نازل ہوئی ہیں جن کے اسباب وحالات میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی بلکہ یہاں زیادہ غور وفکر نہ کرنے والے کیلئے صرف اسی بات کا جان لینا بھی کافی ہوگا کہ سب سے پہلے ﴿اقرا باسم ربک الذی خلق﴾ نازل ہوئی، پھر ﴿یایھا المدثر﴾ اور اس کے بعد ﴿یایھا المزمل﴾ کی آیات اتریں۔

دیکھا جائے کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب میں ان آیات اور سورتوں کی جگہ کیا ہے؟ جب صورت حال یہ ہے تو ان آیات کے درمیان مناسبت تلاش کرنے کے کیا معنی ہیں جن کے بارے میں ہمیں قطعی علم ہے کہ مصحف (قرآن) کی ترتیب میں بعد میں انہیں رکھا گیا ہے جبکہ ان کا زمانہ نزول پہلے کا ہے۔ یا مصحف میں انہیں پہلے رکھا گیا ہے جبکہ زمانہ نزول بعد کا ہے۔ بلاشبہ یہ ایسا عمل ہے جس کا تعلق نزول قرآن کی ترتیب سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ان صحابہ سے ہے جو جمع وترتیب کے ذمہ دار تھے۔ اس طرح کے علم کا نفع کتنا کم، اس کا ثمر کتنا محدود اور اس کا فائدہ کتنا حقیر ہے! بلکہ یہ صاحب فہم کے نزدیک محض تضیع اوقات ہے اور ایسی چیز میں بہت سی گھڑیاں صرف کرنا ہے جو نہ اس کیلئے فائدہ مند ہے اور نہ اور لوگوں کیلئے۔ اور تُو جانتا ہے کہ اگر ایک شخص

مناسبت (نظم) کی تلاش میں پڑ جائے اور اہل ادب و بلاغت کے خطبوں، رسائل اور انشائیوں میں نظم ڈھونڈنے لگے، یا شعراء کے مدحیہ، ہجویہ، غزلیہ اور مرثیہ قصائد اور خطبوں میں، ان کے فقروں اور خاتموں میں مناسبت کے اسباب تلاش کرے جبکہ ادب و کلام کی یہ ساری صنفیں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر تصنع کرتے ہوئے خطیب کے خطبہ جہاد کی خطبہ حج اور خطبہ نکاح اور دوسرے تمام خطبوں میں وحدت پیدا کرے اور تعزیتی انشائیے اور تبریکی انشائیے میں تعلق قائم کرے تو ایسے شخص کو مریض اور فاتر العقل ہی تصور کیا جائے گا جو اپنے اوقات سے کھلواڑ کر رہا ہے اور اپنی زندگی ضائع کر رہا ہے جو اس کا بیش قیمت اثاثہ ہے جب معاملہ ایسا ہے کہ کلام انسانی میں ایسے فعل کو حماقت سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس کلام الٰہی میں اس قسم کے عمل کو کیا کہا جائے گا جس کی بلاغت نے بڑے بڑے زبان آوروں کو خاموش کر دیا اور جس کی فصاحت نے عدنان وقحطان کے فصیح اللسان ادیبوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

ہر شخص خواہ کم علم ہو، یا کامل العلم، جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ عربی میں ہے اور اسے عربوں کی زبان میں نازل کیا گیا ہے اور اس میں عربوں کے کلامی اسلوب اور طرزِ تخاطب کو اختیار کیا گیا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عربوں کا ایک خطیب ایک ہی مقام پر کھڑے ہو کر مختلف و متضاد فنون کلام کو اختیار کرتا تھا چہ جائیکہ دو مقام یا متعدد مقامات یا عمر بھر کے خطبوں کا معاملہ ہو، یہی حال ان کے شاعروں کا تھا۔

اس نظم کے مفسدے پر جس میں بہت سے محققین لغزش کا شکار ہوئے ہیں ہم اتنی ہی تنبیہ کافی سمجھتے ہیں۔ اس مقام پر ہم نے یہ بحث اس لیے کی ہے کہ یہاں اس کا موقع تھا کیونکہ یہاں سے قرآن کا روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہو گیا ہے جبکہ اس سے پہلے گفتگو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے متعلق تھی۔ اگر کوئی بہ تکلف نظم (تلاش کرنے) کا عادی شخص سوال کرے کہ ان آیاتِ (بنی اسرائیل) کا ماقبل (قصہ تخلیقِ آدم) سے کیا تعلق اور مناسبت ہے؟ تو ہم کہیں گے کوئی ربط و مناسبت (نظم) نہیں!''

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی نظم قرآن کے غیر ضروری ہونے کا موقف اختیار کیا ہے جسے ''الفوز الکبیر'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ شیخ عزالدین بن سلام اور دیگر علماء نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ [ملاحظہ

ہو ''الاتقان''] ان کے علاوہ مفسرین امت نے بھی عملی طور پر اس فراہی و اصلاحی نظریے کو خاص اہمیت نہیں دی ہے، اس لیے ان کی تفاسیر بھی اس تکلف سے پاک ہیں۔

''نظم قرآن'' سے خصوصی اعتنا نہ کرنے کا مطلب

مفسرینِ امت کے نظم قرآن کو زیادہ اہمیت نہ دینے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ انہوں نے اس کا بالکل اہتمام نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے جہاں اس کی ضرورت سمجھی ہے اس کا خیال بھی رکھا اور اس کو بیان بھی کیا ہے کیونکہ متعدد مقامات کو جس طرح شانِ نزول کے بغیر سمجھنا مشکل ہے اور سیاق وسباق کو ملحوظ رکھنا بھی نظم ہی کا ایک حصہ ہے۔

اس اعتبار سے مفسرین کا طرزِ عمل ایک فطری طریقہ تفسیر اور نہایت اعتدال پر مبنی ہے کہ انہوں نے حسب ضرورت سیاق وسباق، یعنی نظم کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اس سے یکسر صرف نظر نہیں کیا ہے اور شان نزول کو بھی قرار واقعی اہمیت دی ہے اور اسی کی روشنی میں قرآن کو سمجھا اور سمجھایا ہے۔

خیال رہے کہ یہاں مفسرین سے ہماری مراد وہ مفسرین ہیں جنہوں نے صرف صحیح روایات کو قابل اعتبار سمجھا ہے اور اسرائیلی یا غیر صحیح روایات سے تفسیر میں اعتنا نہیں کیا ہے اگر کہیں ان کا ذکر کیا بھی ہے تو بالعموم ان کے ضعف کی وضاحت بھی کر دی، جیسے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ۔ یا اردو تفاسیر وحواشی میں اہل حدیث علماء کی کاوشیں ہیں، مثلاً: حافظ عبدالسلام بھٹوی کی ''تفسیر القرآن الکریم'' (چار جلدوں میں) راقم کی تفسیر ''احسن البیان'' مولانا محمد عبدہ الفلاح کے ''اشرف الحواشی'' اور تفسیر ''تیسیر القرآن'' از مولانا عبدالرحمان کیلانی (چار جلدوں میں) وغیرہ ہیں۔

جن مفسرین نے تفسیری روایات میں صحت کا التزام نہیں کیا، علمائے محققین کے نزدیک ان کی خاص اہمیت نہیں ہے جیسے الدر المنثور وغیرہ تفاسیر ہیں یا وہ اردو تفاسیر جو صحت روایات کے اہتمام سے خالی ہیں۔ یا جیسے ڈاکٹر وہبہ زحیلی (وفات: ۲۰۱۴ء) کی تفسیر ''التفسیر المنیر'' ہے جو جدید تفاسیر میں نہایت جامع ہے۔ اس میں ربط آیات کا بھی خاصہ اہتمام ہے (ادّعا کے بغیر) لیکن شان نزول کی روایات میں صحت کا اہتمام نہیں ہے۔ صحتِ روایات کے عدم اہتمام نے اس بہترین تفسیری کاوش کے حسن کو کم اور اس کے پایہ اعتبار کو کمزور کر

دیا ہے۔کاش فاضل مؤلف اس کا بھی اہتمام کر لیتے۔غفر الله له.

''نظم'' کا خوش کن عنوان اور احادیث سے اعراض وگریز کا ایمان کش رویہ

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ نظمِ قرآن کو کھولنا قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔دوسرے مفسرین نے بھی یہ کام کیا ہے گو وہ اس کو ربطِ آیات، یا ماقبل سے مناسبت، یا سیاق وسباق کو ملحوظ رکھنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ثانیاً: وہ نظم کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ احادیث اور شانِ نزول کی روایات کو نظر انداز کرنا ناگزیر ہو جائے بلکہ وہ احادیث اور شانِ نزول کی روایات کو فہمِ قرآن میں بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔

فراہی گروہ کا سب سے زیادہ قابلِ اعتراض رویہ یا فکر یہی ہے کہ اس نے نظم قرآن کو اتنی زیادہ اہمیت دے دی ہے کہ ایک تو اس کے عدم قائلین کو واجب القتل تک قرار دے دینا، ثانیاً احادیث کو نظر انداز کر دیا اور ان کے مقابلے میں اپنے خود ساختہ نظریات کو نہ صرف یہ کہ اہمیت دی بلکہ قرآن پر یہ ظلم کیا کہ کھینچا تانی کر کے ان کو قرآنی کے سر مڑھ دیا ہے (جیسے فراہی نظریہ رجم وغیرہ ہے)۔ثالثاً: یہ شوخ چشمانہ جسارت کی کہ شانِ نزول کی روایات کو اپنے خود ساختہ نظم قرآن کیلئے سب سے زیادہ درہم برہم کر دینے والی قرار دے دیا۔نعوذ بالله من هذه الجسارة الجريمة[مباردی تدبر قرآن ص:210]

جب احادیث سے بے اعتنائی کا جذبہ اور شانِ نزول کی روایات کو قرآن کے نظم کو درہم برہم کرنے کا واہمہ یا مفروضہ دل ودماغ پر مسلط ہو تو وہاں احادیث کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟

''تدبر قرآن'' کا سب سے بڑا امتیاز، احادیث سے گریز یا انکار:

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تمام تفسیری ذخیروں میں تفسیر تدبر قرآن واحد تفسیر ہے جس میں نہ صرف یہ کہ احادیث سے مجرمانہ حد تک بے اعتنائی برتی گئی ہے بلکہ متعدد صحیح روایات کو خلاف قرآن قرار دے کر رد کر دیا گیا ہے جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

احادیث سے بے اعتنائی کا اعتراف ان کے مذکورہ سوانح نگار ڈاکٹر اختر حسین عزمی صاحب نے بھی کیا ہے اور اس پر تعجب کا اظہار بھی کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''احادیث کی اس اہمیت وافادیت کے اعتراف کے باوجود عملی لحاظ سے ''تدبر قرآن'' میں

احادیث سے کس حد تک استفادہ کیا گیا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے جائزے سے لگایا جا سکتا ہے:

تدبر قرآن کی جلد اول ۶۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اس میں کل سترہ (۱۷) احادیث لکھی ہیں۔ ان میں نہ صرف ایک جگہ صحیحین، ایک جگہ مسلم اور صرف ایک مقام پر ترمذی کا نام ہے۔ (دیکھیے: تدبر: ۱/۶۷، ۱۱۳] باقی احادیث کے حوالے کی شاید ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جلد دوم ۶۱۰ صفحات پر مشتمل ہے اس میں کل دس (۱۰) احادیث ہیں۔ صرف ایک جگہ بخاری و مسلم کی متفق علیہ کا نام ہے۔ (۲/۴۰۷) باقی نو احادیث کتاب کے نام کے بغیر درج کی ہیں۔

جلد سوم ۶۶۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل چار مقامات پر احادیث بغیر حوالے کے درج ہیں۔ ایک حدیث مکرر لکھی گئی ہے، گویا کل تین احادیث جلد سوم میں ہے۔ [۳/۴۵۹، ۵۳۹، ۵۶۳، ۵۷۲] جلد چہارم کے ۶۹۰ صفحات ہیں صرف دو جگہ ایک ہی حدیث مکرر (دونوں جگہ حوالے کے بغیر) نقل کی گئی ہے۔ [۴/۱۸۵، ۲۵۱] جلد پنجم ۷۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں کل آٹھ احادیث بیان ہوئی ہیں جن میں سے چار ابوداؤد، ترمذی اور دو صحیح مسلم کے حوالے کے ساتھ اور دو بغیر حوالے کے درج ہیں۔ [۵/۳۷۰، ۳۷۳، ۳۷۷، ۳۸۲]

جلد ششم کے ۶۱۶ صفحات میں صرف سات احادیث نقل کی ہیں۔ صحیح بخاری کا نام دو جگہ پر اور ایک جگہ ترمذی کا حوالہ ہے۔ [۶/۲۴۵، ۲۴۶] باقی احادیث کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ [۶/۲۱۱، ۲۱۲، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۶۴] سورۂ لقمان میں والدین بالخصوص والدہ کے مقام کی وضاحت میں استدلال کیا جا سکتا تھا مگر یہاں بھی کسی احادیث کا ذکر نہیں ہے۔ جلد ہفتم کے ۶۳۴ صفحات ہیں، کل سات احادیث لکھی ہیں۔ [۷/۱۴۳، ۲۷۳، ۳۶۲، ۴۶۹، ۵۰۹، ۵۱۴، ۵۱۶] جلد ہشتم کے ۶۲۸ صفحات ہیں۔ کل چودہ (۱۴) احادیث رقم ہیں جن میں صرف ایک حدیث بہ حوالہ بخاری ذکر ہوئی ہے۔ [۸/۲۸۳]

باقی تمام روایات کے ذکر میں کسی حوالے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی گئی۔ [۸/۲۴۷، ۳۰۱، ۳۳۶، ۳۴۰، ۳۸۵۔۳۸۷، ۴۰۳، ۴۲۳، ۴۵۷، ۴۶۶، ۴۶۹، ۵۷۲، ۵۹۷] اور ان میں صرف تین احادیث کا عربی متن درج ہے۔ جلد نہم کے ۶۷۸ صفحات میں کل تیرہ (۱۳) احادیث مذکورہ ہیں جن میں صرف ایک حدیث بخاری و مسلم اور ابن ماجہ کے متفقہ حوالے سے درج ہے۔ [۹/۶۶۶] جبکہ باقی تمام

روایات بغیر کسی حوالے کے بیان ہوئی ہیں۔[۹/۲۲، ۲۶، ۳۰، ۹۳، ۱۹۶، ۲۵۵، ۴۳۷، ۵۹۴، ۶۱۷، ۶۲۱، ۶۲۸]

ان میں صرف چار احادیث عربی متن کے ساتھ درج ہیں۔اس طرح کل ۵۸۴۴ صفحات پر مشتمل تفسیر میں صرف اسّی (۸۰) احادیث جگہ پاسکی ہیں اور ان ذکر کردہ احادیث میں بھی تقریباً ایک چوتھائی تعداد ایسی روایات کی ہے جو بہ طور استدلال بیان نہیں ہوئیں بلکہ مولانا نے ان کا ذکر محض ان کی تردید کیلئے کیا ہے۔(گویا احادیث کی اصل تعداد تقریباً ۶۰ ہے۔ناقل)

اس کے مقابلے میں تفسیر کے اکثر صفحات میں جاہلی ادب اور لغت کی طرف رجحان جھلکتا نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ قدیم کتب سماوی کے طویل اقتباسات بھی جابہ جا نظر آتے ہیں۔'' [مولانا امین احسن اصلاحی، حیات وافکار، ص: ۱۴۵، ۱۴۶۔طبع ۲۰۰۸ء)

اس کی توضیح مزید اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ جن صاحب (منظور حسین عباسی) نے ''تدبر قرآن'' کا توضیحی اشاریہ مرتب کیا ہے اس میں انہوں نے یہ دعویٰ تو کیا ہے کہ ''اشاریے میں سینکڑوں احادیث کے حوالے دیئے گئے ہیں۔'' (ص۹) لیکن اس اشاریے میں ''احادیث'' نام کا کوئی عنوان ہی سرے سے نہیں ہے، یعنی اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا یا دیکھنا چاہے کہ ''تدبر'' میں کتنی حدیثیں بیان ہوئی ہیں، یا وہ کہاں کہاں ہیں تو اشاریے میں سرے سے اس سے تعرض ہی نہیں کیا گیا ہے۔

اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ وجہیں دو ہی ہوسکتی ہیں یا تو اس کے مرتب کے نزدیک بھی اصلاحی صاحب کی طرح حدیث کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اس لیے انہوں نے اس کی فہرست دینا ہی غیر ضروری سمجھا۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ اس میں احادیث کے حوالے چونکہ برائے نام ہی ہیں، اس لیے اس کو الگ عنوان دے کر کیوں نمایاں کیا جائے کہ لوگ کہیں کہ اتنی ضخیم تفسیر (۵۸۴۴ صفحات پر مشتمل) میں صرف یہ چند حدیثیں ہی بار پاسکی ہیں۔

بے خودی بے سبب نہیں۔ غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اصلاحی صاحب کے سوانح نگار ڈاکٹر اختر حسین عزمی کے مذکورہ اقتباس سے بھی اصلاحی صاحب کی حدیث سے بے اعتنائی واضح ہے۔مزید انہوں نے اس پر تاسف اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہ تفسیر

میں جاہلی ادب اور لغت کی طرف تو رجحان جھلکتا نظر آتا ہے اور اس کے علاوہ قدیم کتب سماوی کے طویل اقتباسات بھی جابہ جا نظر آتے ہیں، لکھتے ہیں ''یہ بات ان کے مذکورہ بالا اس قول کی عملی تردید محسوس ہوتی ہے کہ'' قرآن مجید کے اجمالات جس حد تک صحیح احادیث کی روشنی میں کھلتے ہوں اس حد تک ان صحیح احادیث کی راہنمائی سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور ان کے بالمقابل ہرگز کسی دوسری چیز کو ترجیح نہ دی جائے۔'' [مبادی تدبر قرآن، ص ۲۱۸۔۲۱۹] یہ تضاد اس وقت زیادہ کھٹکتا ہے جب مولانا مقدمہ تفسیر میں یہ بھی کہیں کہ ''میں احادیث کو تمام تر قرآن سے ہی ماخوذ مستنبط سمجھتا ہوں۔ اس وجہ سے میں نے صرف انہی احادیث تک استفادے کو محدود نہیں رکھا جو قرآن کی کسی آیت کے تعلق میں صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں بلکہ پورے ذخیرہ احادیث سے اپنے امکان کی حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔''

سوال یہ ہے کہ ان کے ''امکان کی حد'' میں صرف اسی (۸۰) احادیث سے استفادہ ہی پورے قرآن کی تفسیر میں کفایت کر جاتا ہے! یہ بات ان مواقع پر بالخصوص زیادہ کھٹکتی ہے جہاں بعض آیات کی تشریح میں مولانا کے اختیار کردہ موقف کی تائید صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے یا وہاں حدیث کی روشنی میں وضاحت کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے وہاں بھی مولانا نے احادیث سے اعراض برتا ہے۔'' (اس کے بعد فاضل مؤلف نے کئی مثالیں پیش کی ہیں) [کتاب مذکور، ص: ۱۴۶، ۱۴۷]

ہم نے یہ مثالیں اس لیے نقل کیں کہ ہم حدیث کے بارے میں فاضل مؤلف کی طرح اصلاحی صاحب کی بابت خوش گمانی میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ ہم ان کو منکرین حدیث کا سرخیل سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں ان کے اس رویے پر نہ کھٹک محسوس ہوئی ہے اور نہ تعجب ہی ہوا ہے، کیونکہ ان کا یہ رویہ ان کی فکر کے عین مطابق ہے۔ یہ چند جگہیں ہی ایسی نہیں ہیں جہاں اصلاحی صاحب نے حدیث سے اعراض برتا ہے بلکہ پوری تفسیر ہی اس کا بدترین نمونہ ہے۔ جگہ جگہ تفسیری روایات سے اعراض ہے یا ان کا انکار۔ گویا ''تن ہمہ داغ دار شد پنبہ کجا کجا نہم'' والی بات ہے۔

باقی رہی بات تضاد کی تو یہ ایک تضاد ہی نہیں ان کی ساری فکر ہی تضادات پر مبنی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اتنی بڑی شخصیت جس کے علم و فضل کی دھوم ہو اور تضادات کا ملغوبہ! اس کی وجہ ہم ان شاء اللہ آگے چل کر بیان کریں گے۔ بعون اللہ و توفیقہ۔ (جاری ہے)